نیاز سواتی

جدیدیت: مباحث و مسائل کا تحقیقی تناظر

''جدیدیت'' کا لفظ انگریزی اصطلاح ''ماڈرنٹی'' (Modernity) کے اردو متبادل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک زبان کی کسی اصطلاح کا بعینہٖ مفہوم کسی دوسری زبان کا کوئی ایک لفظ مکمل طور پر ادا نہیں کر سکتا، خاص طور پر ایسی اصطلاحات جو اپنا خاص تاریخی، سماجی اور تہذیبی پس منظر رکھتی ہیں، عموماً ناقابل ترجمہ ہوتی ہیں۔ کسی اجنبی زبان کے الفاظ و اصطلاحات کا مطلب معلوم کرنے کا عام اور سادہ طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان میں اس لفظ کا متبادل اور ہم معنی لفظ تلاش کیا جائے۔ بدقسمتی سے یہ طریقہ علمی حلقوں، خصوصاً فلسفیانہ موضوعات اور اصطلاحات کی تفہیم کے ضمن میں غیر معتبر قرار پایا ہے۔ تہذیبی و تاریخی تصورات کا اصل زبان میں باقاعدہ اور دقتِ نظر سے مطالعہ کیے بغیر محض سادہ ترجمے کی بنیاد پر استعمال، ان تصورات کی تفہیم کو نہ صرف مشکل بنا سکتا ہے بلکہ مزید پیچیدگی اور غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ فرڈی ننینڈ ڈی سوسیئر (Ferdinand de Saussure، ۱۸۵۷ء۔۱۹۳۱ء) نے لسانی نظام کو ایک معاشرتی عمل کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس کے پیش کردہ تصور Langue کے مطابق زبان کے داخلی اصول اور شعریات ایک طویل عرصے بعد وضع ہوتے ہیں۔ ہر زبان اپنے داخل میں نشانات و علامات اور تصورات کی الگ دنیا اور پس منظر رکھتی ہے۔[۱] تاریخ، جغرافیہ اور تہذیب کے اختلاف کے سبب زبانیں ہر جذبے کے بیان کے لیے اپنا مختلف اور منفرد پیرایۂ اظہار رکھتی ہیں۔ خوشی اور غم کے تجربات اور واقعات کی روانی سے فہم اخذ کرنے کا انداز ہر زبان کا جدا ہے۔ کسی زبان میں ترجمے کے ذریعے اصل زبان کے متن کے بارے میں جو معلومات مہیا ہوتی ہیں وہ بالواسطہ ہوتی ہیں اور ان پر کلیتاً انحصار نہیں کیا جا سکتا، ترجمے کے الفاظ اور جملے اگر اصل عبارت سے قریب ہوں تب بھی وہ زیادہ سے زیادہ جزوی مطابقت ظاہر کرتے ہیں۔ وٹگنسٹائن (Ludwig Wittgenstein، ۱۸۹۸ء۔۱۹۵۱ء) کا کہنا ہے کہ کسی مخصوص طرزِ زندگی یا تصور کا اس کی زبان کے باہر سے تجزیہ ناممکن ہے، اسے صرف اندر سے، اس کی اپنی اصطلاحات اور لفظیات کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔[۲]

آج کل کی زباں زدِ عام اصطلاحات، بیسک ہیومن رائٹس (Basic Human Rights)، کانسٹی ٹیوشن (Constitution)، فریڈم (Freedom) اور ڈیموکریسی (Democracy) کو بالترتیب

بنیادی انسانی حقوق، دستور، آزادی اور جمہوریت کے عنوانات کے تحت ترجمے کے ذریعے اپنالیا گیا ہے مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ان مفاہیم پر محض سادہ ترجمے کی بنا پر حکم لگانا عموماً غلط فہمیوں کی بنیاد بنتا ہے۔[3] جدیدیت کی اصطلاح کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے۔ اس طرح کی مغربی اصطلاحات ہمارے سیاق وسباق اور تہذیب وثقافت میں استعمال نہیں ہوئیں اور نہ ہی یہ اصطلاحات ہمارے تاریخی اور علمی شعور کا حصہ ہیں لہٰذا ان کی تفہیم وقت نظر اور تاریخی تناظر کے ادراک کے بغیر نامکمل رہے گی۔[4] جدیدیت کی اصطلاح یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے دوران پرورش پانے والی ایک بہت بڑی تبدیلی کی مظہر ہے جو اٹھارھویں صدی میں عروج پر پہنچی نہ کہ اسلامی تہذیب سے برآمد ہونے والی اصطلاح، مگر اس کے مفہوم کے تعین کے وقت انتہائی سادگی سے اسے محض ''نئی چیز'' کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس ''نئی چیز'' کے مفہوم میں ترقی یافتہ فطری، غیر اقداری (Value Neutral) اور 'بہتر' ہونے کے تمام معانی طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔

جدیدیت کی جنم بھومی یعنی یورپ کی تاریخ بتاتی ہے کہ ماڈرنٹی یا روشن خیالی کوئی نیا، فطری اور ترقی یافتہ تصور نہیں اور نہ ہی یہ کوئی غیر اقداری تصور یا اصطلاح ہے بلکہ قدیم ترین یونانی تہذیب کے تصور انسان، تصور تہذیب اور تصور کائنات کی طرف مراجعت اور اس کے نئے سرے سے احیاء کا نام جدیدیت ہے۔

آگے بڑھنے سے پیش تر یہاں وسیع البنیاد یا روح جدیدیت (Modernity)، جمالیاتی جدیدیت (Modernisim) اور تجدید کاری (Modernization) میں فرق کی وضاحت ضروری ہے۔

یورپ میں قرون وسطیٰ (Middle Ages) کے بعد مذہب سے بغاوت کے نتیجے میں جنم لینے والی حاوی فکر یا ذریعۂ علم (Episteme) کے نتائج نے تین صورتوں میں اپنا ظہور کیا:

۱۔ وسیع تر جدیدیت یا روحِ جدیدیت (Modernity)

۲۔ جمالیاتی جدیدیت (Modernism)

۳۔ تجدید کاری (Modernization)

نشاۃ الثانیہ کے بعد مغرب کی فکر میں پیدا ہونے والی بنیادی تبدیلی کا نام وسیع تر جدیدیت یا روحِ جدیدیت (Modernity) ہے۔ تجدید کاری (Modernization) اور جمالیاتی جدیدیت (Modernism)، روح جدیدیت (Modernity) سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں۔[5]

جدیدیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان اپنی ذات سے باہر سے عائد کردہ کسی مقتدرہ کے حکم یا کسی بالاتر ہستی کے پیغام (وحی) کو تسلیم نہ کرے بلکہ ہر چیز کے حسن وقبح کا فیصلہ اپنی عقل اور تجربے کی روشنی میں کرے۔ یہ تجربہ یا تو انسان کا اپنا ہوگا یا پھر کسی اور کے تجربے کو انسان اس شرط پر قبول کرلے گا کہ وہ اسے

اپنے تجربے کی بنیاد پر رد کر سکے۔ ۶؎ جدیدیت قائم ہی اپنے بنیادی نظریے یعنی انسان پرستی پر ہے۔ جس کی انتقادی روح نے اسے خدا مرکز کائنات سے نکال کر انسان مرکز کائنات کا یقین دلایا۔ جدیدیت کی ساری لہریں اسی انسان پرستی کے منشور سے گزرتی ہیں۔ جدیدیت کے مخاطبے (Discourse) میں انسان کا موضوع صرف انسان اور اس کی فردیت (Individualism) ہے۔ ۷؎

جرگن ہیبر ماس (Jürgen Habermas) (۱۹۲۹ء) کا خیال ہے کہ روشن خیالی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ماضی کے کسی حوالے کے محتاج نہیں بلکہ وہ اپنا حوالہ خود ہے۔ روشن خیالی سے قبل کے تصورات اپنے جواز کے لیے کسی نہ کسی حوالے کی محتاج رہے ہیں مگر روشن خیالی نے اپنے تصورات کے لیے ماضی کا کوئی حوالہ استعمال نہیں کیا۔ ہیبر ماس کے الفاظ میں:

It has to creat its own normativity out of itself.

ترجمہ: ''روشن خیالی کو اپنا معیار خود اپنے اندر سے تخلیق کرنا ہے۔ ۸؎

ہیبر ماس کے اس تجزیے کے علی الرغم حقیقت یہ ہے کہ روشن خیالی نے اپنا جواز قدیم ترین اور انسان پرست یونانی تہذیب میں تلاش کر لیا تھا۔ یہ جواز کیا تھا؟ یہ جواز عیسائیت کی علیت کو رد کر کے انسان اور اس کی عقل اور تجربے کو ذریعۂ علم ماننا تھا۔ اب خدا پرستی کی جگہ انسان پرستی نے لے لی۔ معاد کے بجائے معاش قابل ترجیح قرار پائی۔ انجیل کی جگہ عقل انسانی یا سائنس ذریعہ علم قرار پائی۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مطابق جدیدیت نام ہے مذہب اور اس کی روایات کو سائنسی عقلیت کے تابع کرنے کا۔ ۹؎ مگر یہ ساری تبدیلی دو چار برس کا قصہ نہیں بلکہ یورپ کی تاریخ میں صدیوں کے دوران انجام پذیر ہونے والا وہ عمل ہے جو چودھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان (بطور نشاۃ الثانیہ) شروع ہو کر انیسویں صدی میں جدیدیت یا ماڈرنٹی کی شکل میں عروج پر جا پہنچا۔ اس دوران قدیم (عیسائیت) کو رد کر کے قدیم ترین (یونانی علیت) کی بازیافت کی گئی۔ یہ بات نہیں کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں یونانی علوم کو بھلا دیا گیا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی یونانی علوم چونکہ وحی الٰہی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے اس لیے قرون وسطیٰ کا یورپ انھیں ثانوی اہمیت دیتا تھا اور اس دور میں اصل اہمیت مذہبی علوم کو حاصل تھی۔ ۱۰؎ نشاۃ الثانیہ عیسائیت سے تصادم اور انسان پرستی کی بنیاد قرار پانے کے باعث اپنے اندر مذہب بیزاری کا عمومی رجحان رکھتی تھی لہٰذا اس نے عیسائیت سے یونانی دور کی طرف مراجعت اختیار کر لی، اسی یونانی تہذیب کی طرف جو، ہر معاملے کو انسان کے پیمانے سے دیکھتی تھی نہ کہ سماوی ہدایت کی کسوٹی پر۔ قدیم ترین یونانی تہذیب کی طرف جدیدیت کی مراجعت اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ جدیدیت نئی چیز کا نام نہیں بلکہ دراصل یہ رجعت پسندی کے نئے رجحان کا نام ہے۔

اردو ادب میں جدیدیت کے بڑے نقاد محمد حسن عسکری، (۱۹۱۹ء۔۱۹۷۸ء) نے یورپی نشاۃ الثانیہ کو جدیدیت کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔۱۱ نشاۃ الثانیہ (جو روشن خیالی کی بنیاد ہے) نے پہلے یورپ کی علمیت اور پھر اس کی زندگی کے حقیقی عالمِ تمثال (Paradigm) کو تبدیل کر دیا۔ نشاۃ الثانیہ نے روشن خیالی کو جنم دے کر ایک اہم سنگ میل طے کیا۔ اسی روشن خیالی کی کوکھ سے جدیدیت نے جنم لیا۔۱۲ روشن خیالی اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے اپنی امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی مرکزی خصوصیات انسان پرستی (Humanism)، عقلیت (Rationalism) اور انسان کی ذات سے باہر ہر قسم کے ذریعۂ علم اور کسی بھی مقتدر ہستی (خدا) کا انکار ہیں اور یہی مغرب کی آزادی (Freedom) کا حقیقی مفہوم ہے۔ یہ تینوں خصوصیات باہم مربوط اور پیوست ہیں۔ انسان پرستی (Humanism) اس بات کی متقاضی ہے کہ علم کا واحد معیار انسانی عقل یا اس کے نتیجے میں تشکیل پانے والی تجربی سائنس کو مانا جائے نہ کہ وحی یا انسان کی ذات سے باہر کوئی اور ذریعہ علم۔ انسان اور اس کی عقل کو سب کچھ مان لینے کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ انسان اپنے علاوہ کسی مقتدر یا بالاتر ہستی کا محتاج نہ رہے۔ یہیں سے آزادی (Freedom) روشن خیالی یا جدیدیت کا نقطۂ ماسکہ قرار پاتی ہے۔ ان تینوں خصوصیات کا باہمی ربط یہی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۲ء۔۱۹۶۱ء) نے (Humanism) کی وضاحت کرتے ہوئے اسے ایسا مذہبِ انسانیت قرار دیا ہے جس کی رو سے انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے۔ گویا یہ کائنات انسان مرکز (Human Centric) ہے نہ کہ خدا مرکز (God Centric)۔ اس مسلکِ انسانیت کے تقاضے کیا ہیں؟ مولوی عبدالحق کا کہنا ہے کہ عالم آخرت کے بجائے عالم طبیعی (Physical World) کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش اس مسلک انسانیت کا تقاضا ہے۔ مولوی صاحب اس تصور کے مرکزی خیال کی وضاحت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں مذہبِ انسانیت کا پیرو کسی مافوق الادراک ہستی اور وجود (خدا، وحی فرشتے، جن، جنت اور دوزخ) کا قائل نہیں ہوتا بلکہ انسان کی دنیاوی فلاح کی کوشش کو ذریعۂ نجات سمجھتا ہے۔۱۳

یورپی نشاۃ الثانیہ نے اپنے فکری ظہور کے ساتھ کائنات سے متعلق تصورات ہی بدل دیے۔ یہ ہر حوالے سے ایک تبدیلی عظیم (Great Transformation) قرار پائی۔ قرون وسطی کا انسان طبیعی دنیا کو ایک مابعدالطبیعیاتی حقیقت کا ظہور قرار دیتا تھا۔ نشاۃ الثانیہ (Renaissance) نے اسے باور کرایا کہ حقیقت صرف وہی ہے جسے انسانی حواس کے ذریعے سمجھا جا سکے۔ اس طرح غیر محسوس انداز میں مابعدالطبیعیات کے مسائل لایعنی قرار پائے اور اِس دنیا (This World) کو اُس دنیا (That World) سے برتر قرار دیا جانے لگا۔ جدیدیت کی عقلیت پسندی ہر اس مقتدر ہستی، ادارے اور روایت کا بطلان کرتی

ہے جو عقل کی میزان پر پورا نہ اترے۔۱۴ الہام کے بجائے عقل انسانی سے رائے قائم کرنا اور حقیقی علم کا ذریعہ وحی یا کسی مافوق الفطرت ہستی کو سمجھنے کے بجائے انسانی عقل کو سمجھنا عقلیت (Rationalism) کا حقیقی مفہوم ہے۔

یورپی نشاۃ الثانیہ سے شروع ہونے والا جدیدیت کا سفر اٹھارھویں صدی میں روشن خیالی کی منزل پر پہنچ گیا۔ اس دوران پانچویں صدی قبلِ مسیح کے سوفسطائی فلسفی پروٹوغورث (Protagoras) کا قول کہ انسان ہر چیز کو ناپنے کا پیمانہ ہے (Man is the measure of all things) زبردست اہمیت اختیار کر گیا۔ انجیل، کلیسا اور پوپ کے بجائے انسانی عقل، علم کا ذریعہ قرار پائی۔ کرسٹوفر وٹکومب (Christopher L.C.E. Witcombe) نے کہا کہ خدا نہیں بلکہ انسان ہی ہر چیز کا منتہائے مقصود ہے۔۱۵

یہاں ایک تاریخی غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جدیدیت (Modernity) محض عیسائیت کے خلاف ایک ردعمل ہے جب کہ یہ حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت (Modernity) فی نفسہٖ ہر مذہب اور اس کی عطا کردہ اقدار کے خلاف ایک بغاوت ہے جو مذہب خاص طور پر الہامی مذاہب کے علی الرغم اپنی علیت، اپنی اخلاقیات، اپنا تصور کائنات اور سب سے بڑھ کر اپنا تصور انسان رکھتی ہے اسی لیے مریم جمیلہ (۱۹۳۴ء۔۲۰۱۲ء) نے اسے مذہب کے خلاف ایک مسلح بغاوت قرار دیا۔۱۶

انسان پرستی کی وضاحت اور ترویج کے سلسلے میں جرمن فلسفی ایمانویل کانٹ (Emanual Kant، ۱۷۲۴ء۔۱۸۰۴ء) نے روشن خیالی یا جدیدیت کی بہترین تفسیر پیش کر کے سماوی ذریعۂ علم کو جھٹلا دیا اور عقلِ کل کے مقابلے میں ''شعور انسانی'' کو جملہ مسائل کے حل میں بنیادی اہمیت دی۔ اس کے بعد یورپی انسان نے قرون وسطیٰ کی حاوی فکر یعنی عیسائیت کو نظر انداز کر کے محض اپنی مادی خوش حالی کے لیے تسخیرِ کائنات کی تگ و دو شروع کی۔ کائنات میں انسان کے اس بڑھتے ہوئے اور مسلسل عمل دخل نے سیکولرزم، وجودیت (Existentialism) اور فردیت (Individualism) جیسے افکار کو فروغ دیا۔ کانٹ نے اپنے مضمون Was ist Aufklärung? ''روشن خیالی کیا ہے؟'' کے افتتاحی پیراگراف میں اس روشن خیالی کو کسی بیرونی ذریعے (مثلاً وحی) سے انسان کی آزادی کا عمل قرار دیا ہے۔ کانٹ نے لکھا:

ترجمہ: ''روشن خیالی اس ذہنی ناپختگی سے انسان کی نجات کا نام ہے جو اس نے اپنے آپ پر خود مسلط کر رکھی تھی۔ یہ ذہنی ناپختگی دراصل دوسروں کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل و فہم کو استعمال نہ کر سکنے کی کیفیت ہے مگر اس کی وجہ انسانی عقل و فہم کا عدم وجود نہیں بلکہ انسان کے اندر اس جرأت اور پختہ ارادہ کی کمی ہے جو اسے کسی اور کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل استعمال کرنے کے قابل بنا سکے۔''۱۸

کانٹ کا یہ مضمون جدیدیت کی حقیقت اور اس کی حرکیات (Dynamics) پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون کی تفصیلات پڑھ کر کانٹ کو رائدین جدیدیت کا امام ماننا پڑتا ہے۔ دورِ حاضر میں فرانس سے تعلق رکھنے والے بڑے مابعد جدیدی (Post Modernist) مفکر مشل فوکو (Foucault Michel، ۱۹۲۶ء۔۱۹۸۴ء) نے کانٹ کے مذکورہ مقالے کی تشریح کرتے ہوئے اس مقالے کو ایک زمانے کا نہیں بلکہ صدیوں سے یکساں اہمیت کا حامل ایک ایسا مقالہ قرار دیا ہے جو آج تک اہمیت اور آفاقی نوعیت رکھتا ہے۔[۱۸]

یورپی نشاۃ الثانیہ سے موجودہ جدیدیت تک کا سفر تہذیبی و تاریخی تغیر کی داستان ہے۔ مارشل برمن (Marshall Berman) (۱۹۴۰ء۔۲۰۱۳ء) نے اس سفر کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ ابتدائی جدیدیت (۱۴۵۳ءتا۱۷۸۹ء)
۲۔ کلاسیکی جدیدیت (۱۷۸۹ءتا۱۹۰۰ء)
۳۔ موجودہ جدیدیت (۱۹۰۰ءتا حال)[۱۹]

مغربی مفکرین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط یا اختتام سے جو دور شروع ہوا ہے وہ جدیدیت ہی کا ایک حصہ ہے جسے سیال جدیدیت (Liquid Modernity) کہنا چاہیے۔ دوسری طرف مابعد جدیدیت کی فکر کے حاملین کا کہنا ہے کہ جدیدیت کا دور بیسویں صدی کے وسط میں اپنے اختتام پر پہنچ چکا ہے اور اس کے بعد جو دور شروع ہوا ہے وہ مابعد جدیدیت (Post Modernity) کا دور ہے۔ بہرحال زیادہ تر مغربی مفکرین مؤخرالذکر رائے سے متفق نظر آتے ہیں۔[۲۰]

یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے زیرِ اثر مندرجہ ذیل تاریخ ساز انقلابی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں:

۱) مذہبی معاشرے کا لادینیت اختیار کر لینا
۲) زرعی معاشرے کی صنعتی و سرمایہ دارانہ معاشرے میں تبدیلی
۳) پوپ کے اقتدار کی جگہ قومی ریاستوں کی تشکیل[۲۱]

مندرجہ بالا ہر تبدیلی الگ تفصیلی مقالے کی متقاضی ہے مگر یہاں ان تبدیلیوں کے متعلق چند اشارے کیے جاسکیں گے۔

۱) لادینی معاشرے کا قیام (Secularization):

یورپ کی دو بڑی تحریکیں یعنی نشاۃ الثانیہ (Renaissance) اور اصلاح مذہب (Reformation) ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے زیرِ اثر مرتب ہونے والے نتائج میں سرِفہرست نتیجہ یورپ کے مذہبی معاشرے کی جگہ لادینی معاشرے کا قیام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب یورپی معاشروں نے رہنمائی

کے لیے مذہبی ذرائع کے بجائے عقلِ انسانی کو علم کے حقیقی ذریعے کے طور پر قبول کرلیا۔ یورپ کے معاشرے میں ہونے والی بقیہ بڑی بڑی تبدیلیاں اسی بنیادی تبدیلی کا براہ راست نتیجہ تھیں۔

۲) صنعتی و سرمایہ دارانہ معاشرے کا قیام (Industrialization):

یورپ میں صنعتی اور سرمایہ دارانہ معاشرے کے قیام کی حوصلہ افزائی قرون وسطیٰ میں ناممکن تھی کیوں کہ قرون وسطیٰ کا مذہبی پس منظر اس کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ مذہبی یورپ فطرت اور خاندانی و معاشرتی اقدار کو اہمیت دیتا تھا جب کہ صنعتی اور سرمایہ دارانہ عمل میں ان دونوں کا زوال لازمی امر تھا۔ بہر حال یورپ کے مذہبی پس منظر کے کمزور ہوتے ہی یہ معاشرتی تبدیلی یورپ اور پھر دنیا بھر کا مقدر ٹھہری۔ انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے پر اس تبدیلی کے مثبت و منفی اثرات مرتب ہوئے۔ سماجیات، ماحولیات، معاشیات اور فنون لطیفہ غرض کوئی بھی شعبۂ زندگی تبدیلی کے عمل سے محفوظ نہ رہ سکا۔ آج کے جدید طرز زندگی کے مثبت و منفی اثرات کی بنیاد دراصل اسی تبدیلی نے رکھی ہے۔

۳) قومی ریاستوں (Nation States) کا قیام:

نشاۃ الثانیہ سے قبل کے یورپ میں اگرچہ بادشاہتیں قائم تھیں مگر ان کے بادشاہ پوپ کے زیر نگرانی فعّال تھے۔ حکمرانوں کا عزل و نصب کلیسا کی منشا پر منحصر تھا، حتیٰ کہ پوپ کسی غیر اخلاقی حرکت پر بادشاہوں کو سزا دینے کا بھی مجاز تھا۔ یورپ کا ہر حکمران، اپنی حکمرانی کی سند پوپ سے حاصل کرتا تھا۔ یہ سب کچھ محض رسمی نہ تھا بلکہ حقیقی اقتدار کلیسا ہی کا قائم تھا۔ نشاۃ الثانیہ کے دوران یورپی حکمرانوں نے کلیسا کی غلامی کا طوق اتار پھینکا۔ قومی ریاستوں کے قیام کا مرحلہ ہنوز دور تھا مگر اس کی عمارت کی بنیادی اینٹ رکھی جا چکی تھی۔ قومی ریاستوں کی جانب اس سفر نے فرد کی آزادی کے منصوبے کو مہمیز دی۔ جدید ریاستوں کے اداروں اور تصور نے انسانی آزادی کے لیے آلۂ کار کے طور پر کام کیا اور بالآخر ۱۶۴۸ء میں یورپی طاقتوں کے مابین ہونے والے امن کے تاریخی معاہدہ ویسٹ فیلیا (Peace Treaty of Westphalia) نے اس ضمن میں اہم سنگ میل طے کرتے ہوئے قومی ریاست کی راہ ہموار کردی۔ جمہوریت (Democracy)، انسانی حقوق (HumanRights) اور دستوریت (Constitutionalism) جیسے تصورات کا ظہور قومی ریاست کے ارتقا کا مرہون منت ہے۔ بہر حال جدید قومی ریاستوں کے قیام نے قوم پرستی (Nationalism) کے تصور اور اس کے ارتقا کے ضمن میں عمل انگیز کا کام کیا۔ قوم پرستی کا لازمی نتیجہ یورپی اقوام کے درمیان حسد و حرص کی فضا کو جنم دینے کا باعث ہوا۔ نو آبادیاتی دور اسی حسد و حرص کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس دور نے اس جلتی آگ پر تیل ڈالا۔ اپنی حرص کی تسکین کی خاطر یورپی اقوام نے نو آبادیات میں انسانی قتل عام سے بھی دریغ نہ کیا۔ مشہور

امریکی دانش ور پروفیسر مائیکل مین(Michael Mann، ۱۹۴۲ء۔) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (The Dark side of Democracy) میں رقم طراز ہیں کہ جدیدیت نے قتلِ عام کو نسلی صفائی کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلایا جس کی واضح ترین شکل جمہوریت ہے اور اسی نسلی صفائی نے جمہوری قومی ریاست ایجاد کی۔[۲۲]

نوآبادیات بنانے کے عمل میں پیچھے رہ جانے والی یورپی اقوام نے بھی کچھ عرصے کے بعد انگڑائی لی اور لوٹ مار کے اس عمل میں اپنا حصہ طلب کیا۔ اس صورت حال نے مزید پیچیدگی اختیار کی اور بالآخر یورپی اقوام اور دنیا کو یکے بعد دیگرے دو عظیم جنگوں کا سامنا کرنا پڑا جن کے بھیانک اثرات سے دنیا تادیر پیچھا نہ چھڑا سکی۔

انسان پرست نظر آنے والی جدیدیت کے مطابق سائنس، آفاقی اخلاقیات، قانون اور آرٹ اپنی اندرونی منطق کے مطابق خود مکتفی ہیں۔ اس منصوبے کا مقصد سائنس، انسانی عقلیت اور آزادی کے کلچر کا انسان کی روزمرہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال تھا۔ جدیدیت چونکہ اپنی ایک مادّی بنیاد رکھتی ہے لہٰذا انسان پرستی کے جدید نظریہ میں انسان کی مادی اور جبلّی خواہشات کی آزادانہ تسکین کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی مگر انسان پرستی کا یہ دعویٰ بھی ایک فریب ثابت ہوا کیوں کہ جدیدیت نے انسان کی مادی خواہشات کی تسکین کرنے کے بجائے انھیں مزید بڑھانے اور مصنوعی خواہشات پیدا کرنے کی ایک پوری صنعت (اشتہار بازی) تشکیل دے کر ان کی عدمِ تسکین کے مزید سامان فراہم کر دیے۔

اب جدیدیت کے سب سے بڑے دعوے یعنی انسان پرستی نے عملی طور پر سرمایہ پرستی کی شکل اختیار کر کے تلخ نتائج سے دنیا کو آگاہ کیا۔ انسان پرست کہلائے جانے والی جدیدیت کے انسان کش نتائج قوم پرستی، سرمایہ داری، کمیونزم اور فاشزم کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ جدیدیت یکے بعد دیگرے اپنے ہر دعوے میں ناکام ثابت ہوئی جس نے اسے خود اس کی جنم بھومی یعنی یورپ میں غیر مقبول کر دیا۔ جدیدیت اپنے منطقی نتائج کا بوجھ نہ سہار سکی اور اپنی ہی جلائی ہوئی آگ کی راکھ تلے دب گئی۔ جدیدیت کے بدیہی نتائج اور اس کے منصوبے کی ناکامی نے مابعد جدیدیت (Post Modernity) کو جنم دیا، جس نے جدیدیت کے تمام آفاقی دعووں (Meta Narratives) پر سوالیہ نشان لگانے کے بعد ان کی تخریب (Deconstruction) کر کے جدیدیت کو اسی کے دلائل سے فکری میدان میں شکست دے دی۔

جدیدیت سے مابعد جدیدیت کے اس فکری سفر میں جدیدیت کے قائم کردہ ادارے اپنی اپنی جگہ برقرار رہے مگر ان سب کی افادیت مشکوک ہو گئی۔ جدیدیت کی مرتب کردہ تاریخ اب طاقت ور مغرب کا نقطۂ نظر کہلائی جو مغرب کی تکنیکی ترقی، سرمایہ داری اور نوآبادیاتی دور کا پُرفریب بیانیہ ہے۔ اب سائنس کی

معروضیت پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا گیا جو کل بھی جدیدیت کا سب سے مؤثر ہتھیار تھا اور آج بھی ہے۔ جدیدیت کی حیثیت ایک عقلی نظریہ کے بجائے معمے (Myth) سے زیادہ نہ رہی۔

جدیدیت کی اساس پر قائم شدہ نظام میں ان مصنوعی خواہشات کی تکمیل زیادہ سے زیادہ سرمائے کے ذریعے ہی ممکن ہے لہٰذا اس کا براہ راست نتیجہ مغرب کی طرف سے پوری دنیا کو اپنی کالونی بنانے (Colonization) اور دو عظیم جنگوں کی صورت میں نکلا۔ جدیدیت کے اس بدیہی نتیجے نے اس کے چہرے سے انسان پرستی کی نقاب اتار پھینکی اور انسانیت نوازی کے جدید منصوبے کو پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ مگر ابھی شوق کے مرحلے باقی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد روشن خیالی اور نشاۃ الثانیہ کا مثالی انسان (Man of Renaissance) دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں میں مصروف ہو گیا۔ سائنس اس کے جنگی عزائم کی آلۂ کار ثابت ہوئی اخلاقیات سیاسی اور قوم پرستانہ تعصبات کی نذر ہو گئی۔ قانون طاقت ور کا حکم بن گیا۔ آرٹ حیوانی جبلّت سے مغلوب ہو گیا اور انسانی قدریں پامال ہو گئیں اور جدیدیت کا یہ شان دار منصوبہ ہیروشیما، ناگاساکی اور یورپ کے کروڑوں دم توڑتے انسانوں اور بے رحم بارود کے بوجھ تلے ڈھیر ہو گیا۔ اس طرح انسان پرستی کی تحریک اپنے معکوس ہدف تک پہنچ گئی۔[۲۳] یورپ میں دو عظیم جنگوں کے بعد کا یہ وقت جدیدیت کے منصوبے سے عمومی بیزاری کا تھا اور اس کے منصوبے پر شکوک وشبہات کے اظہار کا بھی یہی وقت ہے۔

جدیدیت اور تجدید کاری (Modernization) کے منصوبے نے جس طرح کرہ ارض کو مجروح و مضروب کیا اس نے جدیدیت کے انسان دوست اور انسان مرکز (Human Centric) ہونے کی حیثیت کو بھی گہنا دیا۔ جدیدیت کے بیش تر کارنامے جمہوریت، ترقی، انسانی حقوق، ٹیکنالوجی اور شہریانے کا عمل (Urbanization) اپنے نتائج کے حوالے سے ناقابل دفاع ثابت ہوئے۔ مختصر یہ کہ جدیدیت، انسانی فلاح اور حریت و آزادی کو آگے بڑھانے کے بجائے انسانی محکومی اور تابع داری کا ایک طریقہ کار بن کر رہ گئی اور بقول حنا آرینٹ (Hannah Arendt، ۱۹۰۶ء۔۱۹۷۵ء) جدید دور جو انسانی تخلیقی قوت کی اتنی بے مثل اور اُمید افزا کامرانیوں سے شروع ہوا اس کا خاتمہ اتنی لاحاصل اور مہلک ترین مجہولیت میں ہوا کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔[۲۴] دیویندر اسّر نے جدیدیت اور اس کے زیر اثر زیادہ تر نظریات کی ناکامی کی بنا پر اس کے پورے منصوبے کو نہ صرف ناکام قرار دیا بلکہ جدیدیت کی آفاقی صداقت، مطلق اقدار اور معروضیت کو مشکوک قرار دیا۔[۲۵] پروٹسٹنٹ اور جدید مغربی مفکرین نے قرون وسطیٰ (Middle Ages) یورپ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہوئے اسے تاریک خیال، جاہل، فرسودہ اور پس ماندہ قرار دیا مگر قرون

وسطیٰ اور جدیدیت کے حامل مغرب کا تقابل کسی طرح بھی جدید مغرب کو قرونِ وسطیٰ سے فائق اور بہتر ثابت نہیں کرتا بلکہ ایسا ہر تقابل قرون وسطیٰ کی یورپ پر فوقیت کو واضح کرتا ہے۔ جدیدیت فی نفسہ انسان کی کلی آزادی کی داعی ہے۔ اس آزادی کے منطقی نتائج یورپی اقوام کے درمیان طاقت اور دولت کی بڑھتی ہوئی ہوس کی صورت میں نکلے جنھوں نے پوری دنیا کو مغربی طاقتوں کے شکنجے میں کس کر انھیں مغرب کی کالونی بنا دیا۔ اسی ہوس کا ایک منطقی نتیجہ انسانوں کے قتل عام کی صورت میں برآمد ہوا۔ امریکہ کے سرخ ہندیوں (Red Indians) اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں (Aborginies) کی نسلی صفائی اور دو عظیم جنگوں میں مرنے والے انسانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچا دی گئی۔

مائیکل مین نے جدیدیت کے ہاتھوں ہونے والے قتل عام پر اپنی تحقیقی تصنیف : (The Dark Side of Democracy) میں جدیدیت اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی مغربی تہذیب کے انسانی قتل عام سے براہ راست تعلق کو واضح کیا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر امریکہ، جرمنی، یوگوسلاویہ، اسرائیل اور روانڈا میں ہونے والی کروڑوں ہلاکتوں کی تفصیلات روح فرسا اور تفصیل طلب ہیں۔ یہاں جدیدیت اور انسانی قتل عام میں پائے جانے والے قریبی تعلق کے بارے میں چند اشارے کیے جا سکیں گے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف نے یہ معنی خیز بات کہی کہ انسانی قتل عام یا نسلی صفائی (Ethnic Cleansing) کا تعلق جدید مغربی تہذیب کے باہر سے یا کسی قدیم دور سے نہیں بلکہ یہ برائی خود اسی تہذیب کی پیدا کردہ ہے۔ [۲۶]

آگے چل کر مصنف جدیدیت اور قتل عام کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ہٹلر اور اس کے نسل پرست ساتھی جرمنی میں وہی کچھ ہی تو کر رہے تھے جو امریکیوں نے جدید امریکی ریاست کی بنیاد رکھتے ہوئے ریڈ انڈینز کے ساتھ کیا تھا۔ [۲۷]

قرون وسطیٰ ۵۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کے ہزار سالہ دور پر مشتمل ہے مگر جدیدیت نے اپنے ڈھائی سو سالہ دور میں جس قدر قتل عام کیا، قرون وسطیٰ کا انسان اپنی تمام تر تاریک خیالی اور جہالت کے باوصف اس کا عشر عشیر بھی نہ کر سکا۔ خاندانی نظام و اقدار اور کرہ ارض اور ماحولیات کی تباہی اس پر مستزاد ہے۔ دور کیوں جائیں دور جدید میں نیٹو اور امریکی افواج نے افغانستان اور عراق میں معصوم بچوں اور عورتوں کی قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے ان افواج کو جاہل اور تاریک خیال کون کہہ سکتا ہے مگر قتل و بربریت کی یہ تاریخ قرون وسطیٰ کے تاریک خیال، جاہل اور مذہبی انسان کے ہاتھوں نہیں بلکہ جدید ترقی یافتہ، روشن خیال، ترقی پسند اور جمہوری مغرب کے ہاتھوں رقم کی جا رہی ہے۔ دراصل قرون وسطیٰ کی ظالمانہ تصویر پیش کرنے کے بعد

جدیدیت نے اپنے تمام جرائم سمیت اس تصویر کے پیچھے اپنے مکروہ چہرے کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔مگر جدیدیت کے بدیہی نتائج نے ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا ہے۔

حالی سے لے کر حال تک ہم نے پیروی غرب کا حق ادا کرنے کی بہتر سے بہتر سعی کی ہے۔مغرب سے جدیدیت کی آمد کے بعد سے ہم نے بھی مغربی دانش کے ہمراہ اس کی تعریف اور دفاع کا حق ادا کیا ہے مگر بعد میں جب خود مغرب نے جدیدیت کے نتائج دعواقب کا جائزہ لینے کے بعد اس سے اعراض اور بیزاری کی روش اختیار کی تو ہمارے ہاں بھی جدیدیت گریز رجحان کا آغاز انھیں دانش ورحضرات کے ہاتھوں ہوا جواب تک جدیدیت کے پر جوش وکیل تھے۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب میں ہونے والی نظریاتی الٹ پلٹ میں ہم محض تماشائی اور مقلدِ محض کا کردار کب تک ادا کریں گے اور کیا پیروی مغرب کے بارے میں حالی کا مشورہ کسی آفاقی حقیقت کا آئینہ دار ہے جسے ہر حال میں اپنانا ضروری ہے؟ اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہم روایت، اقدار، تاریخ، فہم اور تہذیب سے محروم محض افراد کا ایک گروہ ہیں جو مغرب سے بلند ہونے والے ہر نعرے پر سر دھنتے رہیں؟ اس سوال کا جواب ہمارے لیے جدیدیت سے متعلق فکر وعمل کے نئی راہوں کا تعین کرے گا۔

حواشی:

۱۔ فہیم اعظمی، ''آراء۔۲''، مکتبہ صریر، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص۱۸۲۔
۲۔ ناصر عباس نیر، ''جدید و مابعد جدید تنقید''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص۸۹۔
۳۔ ڈاکٹر منظور احمد، ''مابعد جدیدیت''، مطبوعات نیازیہ، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص۷۔
۴۔ ایضاً، ص۸۔
۵۔ ''جدید و مابعد جدید تنقید''، ص۲۳۔
۶۔ سلیم احمد، ''مضامینِ سلیم احمد''، (مرتبہ جمال پانی پتی)، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۲۹۱۔
۷۔ ضمیر علی بدایونی، ''جدیدیت و مابعد جدیدیت''، اختر مطبوعات، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص۳۷۰۔
۸۔ جرگن ہیبر ماس (Habermass, Jurgen)، The Philosophical Discourse of Modernity، کیمبرج، ۱۹۸۷ء، ص۷۔
۹۔ سیلگ مین آر۔اے (Selugman R.A)، Encyclopedia of Social Sciences، نیویارک، ۱۹۵۹ء، ص۵۶۴۔
۱۰۔ محمد حسن عسکری، ''جدیدیت''، ادارۂ فروغِ اسلام، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص۳۹۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ آراء۔۲،ص۱۴۶۔

۱۳۔ مولوی عبدالحق، "The Standard English-Urdu Dicionary"،انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۸۵ء ،ص۵۴۸۔

۱۴۔ ''جدید و مابعد جدید تنقید''،ص۳۱۔

۱۵۔ http://witcombe.sbc.edu/modernism/roots.html

۱۶۔ مریم جمیلہ، Islam And Modernism،محمد یوسف خان اینڈ سنز، لاہور،۱۹۶۵ء،ص۱۶۔

۱۷۔ www.english.upenn.edu/~mgamer/Etexts/kant.html

۱۸۔ http://foucault.info/documents/whatIsEnlightenment/foucault.whatIsEnlightenment.en.html

۱۹۔ http://en.wikipedia.org/iki/Modernity

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ مائیکل مین (Mann,Michael)،The Dark Side of Democracy،کیمبرج یونی ورسٹی پریس، کیمبرج،۲۰۰۵ء، دیباچہ ص۹۔

۲۳۔ ''جدید و مابعد جدیدیت''،ص۳۷۵۔

۲۴۔ دیویندر اسّر ،''مابعد جدیدیت یا جدیدیت تحریر ثانی''،مشمولہ ''جدیدیت کا تنقیدی تناظر''،مرتبہ، اشتیاق احمد، بیت الحکمت لاہور، ۱۹۹۶ء،ص۳۱۷۔

۲۵۔ ایضاً،ص۲۲۳۔

۲۶۔ The Dark Side of Democracy،دیباچہ ص۹۔

۲۷۔ ایضاً۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ بدایونی، ضمیر علی:۱۹۹۱ء،''جدیدیت و مابعد جدیدیت''،اختر مطبوعات، کراچی۔

۲۔ پانی پتی، جمال (مرتب):۲۰۰۹ء،''مضامینِ سلیم احمد''،اکادمی بازیافت، کراچی۔

۳۔ جرگن ہیبر ماس:۱۹۸۷ء(Habermass, Jurgen)، The Philosophical Discourse of Modernity،کیمبرج۔

۴۔ دیویندر اسّر :۱۹۹۶ء،''مابعد جدیدیت یا جدیدیت تحریر ثانی''،مشمولہ ''جدیدیت کا تنقیدی تناظر''،مرتبہ، اشتیاق احمد،

بیت الحکمت لاہور۔

۵۔ سیلگ مین آر۔اے (Selugman R.A)، Encyclopedia of SocialSciences، نیویارک۔

۶۔ عبدالحق، مولوی:۱۹۸۵ء، "The Standard English-Urdu Dicionary"، انجمن ترقی اردو کراچی۔

۷۔ عسکری، محمد حسن:۱۹۹۷ء، ''جدیدیت''، ادارۂ فروغِ اسلام، لاہور۔

۸۔ فہیم اعظمی:۱۹۹۷ء، ''آراء۔۲''، مکتبہ صریر، کراچی۔

۹۔ مائیکل مین:۲۰۰۵ء، (Mann,Michael)، The Dark Side of Democracy، کیمبرج یونی ورسٹی پریس، کیمبرج۔

۱۰۔ مریم جمیلہ:۱۹۶۵ء، ''Islam And Modernism''، محمد یوسف خان اینڈ سنز، لاہور۔

۱۱۔ منظور احمد، ڈاکٹر:۲۰۰۳ء، ''مابعد جدیدیت''، مطبوعات نیازیہ، کراچی۔

۱۲۔ نیر، ناصر عباس:۲۰۰۴ء، ''جدید و مابعد جدید تنقید''، انجمن ترقی، اردو پاکستان، کراچی۔

ویب گاہیں:

۱۵۔ http://witcombe.sbc.edu/modernism/roots.html

۱۷۔ www.english.upenn.edu/~mgamer/Etexts/kant.html

۱۸۔ http://foucault.info/documents/whatIsEnlightenment/foucault.whatIsEnlightenment.en.html

۱۹۔ http://en.wikipedia.org/iki/Modernity